

۱۹۲۲ء

کی

# بہترانیں

مرتبہ: حلقة اربابِ ذوق لاہو

۱۹۸۲ء

# بہترین نظریہ

مرتبہ :-

حلقة اپاپ ذوق

# اُردو بکٹھال لامہو

قیمت

تعداد - ۱۰۰۰

مکٹھل پرمیں طہیر الدین پرنٹر پبلیشر نے اُردو بکٹھال لامہریدر وارڈ لاہور سے  
شائع کی

# فہرست

۶۶	آدمی رات کو
۳۱	آرزو کا کھیل
۵۲	آمناسامنا
۳۱	انادُنسر
۸۳	ازکار
۷	ایک سوال
۷۳	برغبار می
۲۳	بے بسی
۹	بیٹھے کی شادی
۷۴	پوچھا
۶۱	تَحْدِيد
۵۲	تَقْدِید ابراہیم
۸۵	جائگئے کا خراب
۵۵	حجونکا
۷۵	چاندنی
۶۳	خیال و دبارہ می بلپت
۱۳	دستنک
۳۶	دنیا

	دھوپ کے سائے ..
۳۵	ویدہ نیلگوں
۲۵	رائگ اور بیراگ
۳۷	سیت کی لہریں
۲۹	زندگانی
۳۶	سائے ..
۳۲	سپاہی کی ولہن
۳۸	<u>ستہ</u>
۴۹	سردوں
۷۱	پنچالا
۱۵	سہارا
۲۹	... کے نام
۱۷	مجادر
۱۹	محبوبی
۸۰	ملاثات
۵۹	مقارفت
۴۱	نادافی
۳۹	نیامکان
۳۰	پاس

# پیش لفظ

گئے سال ہے نے لکھا تھا کہ نظموں کے ان مجموعوں کو جھاپنے کے لئے ہمارا معاہدہ آئندہ پائیج  
سال کے لئے مکتبہ اردو لامبہ رکبیاں تھے ہو گیا ہے ہمیں ایسا ان تھا کہ ایسے ناشر جو اپنے آپ کو ادب کی جدید  
تحریکوں سے دہستہ کرنے کے ممکنی ہیں اس مسئلے میں کوئی الجھن پیدا نہ کریں گے لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ  
لکھنے والوں کو ایسے ناشر دل سے بھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔

مکتبہ اردو لامبہ رکبیاں نے اپنے  
آپ کو ایک نقاد کی حیثیت سے بھی پیش کرنا چاہا اور نظموں کے انتخاب میں بعض تجارتی اور کار و باری  
پہلوؤں کو مذکور رکھنے کے ایسے مشورے میں جو نہ صرف غیر متوقع تھے بلکہ حلقہ ارباب ذوق کے  
واسع اصولوں کے صریح اختلاف تھے پچانچہ ہمیں انسوس ہے کہ ہم ان سے متفق نہ ہو سکے اور ایک  
ہمیشے کی بیت ولعل اور کشمکش کے بعد یہ معاہدہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

پہلے سال ہم نے ان صفحات میں چند غلط فہمیوں کو رفع کرنا چاہا تھا۔ ”کبھی نہ مانے والوں“  
سے قطع نظر حالات کے مطالعہ سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہماری گزارشات نے مبشر مفترضین پر  
خوشگوار اثر چھوڑا ہے۔ اور اردو نظم کی ترقی کے سلسلے میں ہماری پُر خلوص کو ششیں عمومی طور پر  
بھی بار آ در ہونے لگی ہیں۔

شاعروں کی توتایا نہیں لیکن ان کے بعض سراہنے والوں کو ان مجموعوں میں بعض نظموں کو دیکھ  
کر یا اپنی بعض سپندیدہ نظموں کو نہ پا کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں کہیں مرتب شاعر کے ساتھ پوے  
طور پر انصاف نہیں کرتے یعنی کہ بعض شاعروں کی جو نظمیں انتخاب کی جاتی ہیں وہ ان کے نزدیک ان

شاعر دل کی نمائندہ نظمیں نہیں ہوتیں یا جو نظمیں انتخاب نہیں کی جاتیں دراصل وہی آن شاعر دل کے مخصوص رنگ کی حامل ہوتی ہیں۔ ہمیں افسوس ہے۔ ہمارے انتخاب میں آن کی رائے بار نہیں پا سکی اور ایسے مجموعے ان کے اذہان سے ابھی ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ البتہ اس باعثے میں ہمیں یہ ضرور کہتا ہے کہ یہ حضرات اعتراض کرتے وقت اس بنیادی بات کو ہجھول جاتے ہیں کہ ایسے مجموعوں کا مقصود شاعر دل کو پیش کرنے کی بجائے ایک سال کی بہترین نظموں کو سامنے لانا ہے۔

بعض حضرات کو یہ مگن بھئے ان مجموعوں کا انتخاب سرف انہی نظموں میں سے کیا جاتا ہے۔ جو حلقة اربابِ ذوق کے جلسوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ ہم متعدد بار کہہ چکے ہیں کہ انتخابی کمیٹی اس مجموعے کیسے آن تہم نظموں کا جائزہ لیتی ہے جو ہندوستان کے طول و عرض ہیں چھپنے والے اور دور رسائل میں شائع ہوتی ہیں۔

سال کی بہترین نظموں کا پہلا مجموعہ پیش کرتے وقت نظموں کو انتخاب کرنے کے مسئلے پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اگرچہ طریقہ کار اب بھی وہی ہے لیکن اس سال کی انتخابی کمیٹی کی رپورٹ منظر ہے کہ اس نے اس مجموعے کو آخری صورت دیتے وقت یہ فیصلہ کیا کہ کسی شاعر کی تین سے زیادہ نظمیں شامل کتاب نہ کی جائیں۔ پچھلے سال خیال تھا کہ تم سال ان مجموعوں کی نظموں پر لکھے گئے تنقیدی مصیہں کو عائد کتابی صورت میں شائع کیا گیں گے لیکن بالآخر کی پابندیوں کے زیراثر ہم ابھی ایسا کر سکیں گے۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ فیصلہ جنگ ختمِ جون سے پہلے شروع نہ ہو سکے گا۔

حلقة اربابِ ذوق کی کیفیت کا کوئی چندہ نہیں ہے۔ چنانچہ انتظامی کمیٹی کے فیصلے کے مطابق ان مجموعوں کی تعداد آمد فی اس انجمن کے اخراجات کے لئے وقت ہو گی۔

آخر میں ہم آن تہم شمرا کے شکر گزار ہیں جن کی نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں۔

مرکزِ حلقة اربابِ ذوق  
و اپنی ایم سی اے بیڈنگ۔ مال روڈ لاہور

# اک سوال

ز میں کے تاریک گھرے سینے میں چینک د اس کا جنم خاکی

یہ سیگلوں نرم نرم کرنیں —

جو ماہ انجسم سے پھوٹتی ہیں

یہ نیلگلوں آسمان کی دنیا

یہ شرق اور غرب کے کنارے

یہ میوہ ہائے لذیذ و شیریں

یہ حسن بے نام کے نظارے

کبھی نہ اس کو جگا سکیں گے

جو ان دلکش حسین چھرے سے چھپیں لی غم نے تا بنائی

کھلی ہوئی بد نصیب سہ انکھیں

یہ وکھیتی تھیں کہ آدمی نے

اک اپنے ہی جیسے آدمی پر  
 تمام دروازے بند کر کے  
 بھیت کو جگا دیا ہے  
 لذیذ انبار مستول کے  
 سیاہ پر دوں میں دبکے ہیں  
 اور آخرش راندہ بہاں سے زمیں کی آغوش نے وفا کی  
 اسی لئے کیا اُگا کریں گے  
 یہ نرم پودے یہ نرم شاخیں  
 کہ ان کو اک روز ہم اھٹا کر  
 خراں کی آغوش میں سلا دیں؟

اختر الامیان  
 (ادبِ طیف لاہور)  
 جنوی ۱۹۷۴ء  
 (پ، ۱۹۱۸ء)

# بیٹے کی شادی

چھہ ہزار تھمینہ کم سے کم چڑھاوے کا  
 راگ اور کیا لاتا زیر دبجم چڑھاوے کا  
 اے شیب کی امی کون غم چڑھاوے کا  
 باغ و قطعہ آرachi جا کے تہن رکھتا ہوں

اہماں شادی میں ہم درا جو چوکیں گے  
 سوبنا میں گے با میں سو جنم پہنچو کیں گے  
 تیر نکتہ چینپول کے وہ نہیں کہ اوکیں گے  
 دوستوں کا یہ عالم دشمنوں کو کیا کو سوں

نسن رہی ہو پھر دل میں رہن کی صد اگونجی  
 لوگ سرکٹاتے ہیں اپنی بات پر کیوں جی؟  
 «باغ و قطعہ آراضی آپڑے تو کیا پوچھی  
چھھ مزار کم کیوں ہیں۔ لو میں تم کو سمجھاؤں

لُزْجَن سے بارہ سو سو د پر منگالیں گے  
 دو ہزار سے اُونچے پاس کے ملا لیں گے  
 زنگ بھی رچا لیں گے تاک بھی بجا لیں گے  
 دل سماج کا بھر جائے دیکھنا وہ دعوت دل

تہن سے نہیں کاغم بھی سے کیوں آخر؟  
 جو کبھی سوارہ دھنگی۔ میں حیات ہوں آخر  
 نوج اکیا میں لونڈی ہوں کیوں نہ لائے دوں آخر  
 کل کی بات ہے جھوم مریا تہن ہی کیوں؟

پیلوں پر کھمڑی سرا و پری ساہ چھتا ہے،  
 یہ خصاب رہنے دو۔ کہہ رہے تھے اچھا ہے  
 کہہ سکوں گی کس کس سئے بہن یہ نزلائے ہے"  
 جانتی ہیں "انابی" کون سنہ کی پیدا ہوں

اب انہیں بھی لے دوڑیں اپنی ہمہنوا فی میں  
 اور بات مطلب کی ڈال دمی کھٹا فی میں  
 حق نہیں اوچھروں کو بنہم خود نمائی میں  
 بنہم خود نمائی سے تم کھچو تو میں نچ لوں

ہاں تو "بیند باجا" بھی آچکا۔ برا قی بھی  
 مستعد ہے آتش باز "شیخ شب برا قی" بھی  
 تھم گئی "رقم پشیہ" ناپستی بھی گا قی بھی  
 خور توں سے تم ہجگتو میں سوار بیال بھجوں

کیوں بھری چلی جائیں۔ رنگ ہے جیل تھوڑی ہے  
کیوں ٹھنسی چلی جائیں۔ رنگ ہے ریل تھوڑی ہے  
ہاں لدمی چلی جائیں۔ رنگ ہے کھیل تھوڑی ہے

”بیٹھ اے سلیمہ پیٹھ روہی ہے۔ تھپڑ دوں“

---

گھٹ گئی مری سمجھی ہٹ تو جاتےے دار می  
اے بُوا سیرا آنخل۔ اے سکھی مری سار می  
”تو می اے رہنست“ پھر مر ہو گئی حندامار می  
پھوڑ دوں تےے دیےے گھونے کا بدالہ دوں

”تھہر مایہ جھنٹے خال“ یہ برات دیکھیں گے  
”ٹھاٹھ دار باجے کی کائنات دیکھیں گے  
جھانکتے ہوئے جلوئے پانسات دیکھیں گے  
موت آئی ہے سائے؟ تو تھہر میں چلتا ہوں

مہر چاہئے آتنا جو اونہ سہ پائے  
 چاہئے شرافت کی انتہا نہ ہو پائے  
 روزخانہ جنگلی ہو۔ فیصلہ نہ ہو پائے  
 در نہ سو طلاقیں ہوں چاڑیں مخل کیوں؟

ڈیڑھ سو کی "آمد" میں کبے دم درود "آتنا  
 "بل" فلاں فلاں اتنے" گز بھن کو سوو اتنا،  
 ختم رہن کی مدت" صرف "سہست دیوڈ" اتنا  
 "تار تار" گھر بھر کا۔ لا ویز بچ آتا ہوں۔

شاو عارفی

(پ، سنہ ۱۹۰۴)

(ہماں لاهور)

جنوری ۱۹۲۳ء

# دستک

کھلکھلاتا ہے درخت کوئی  
 انشار، اشکِ گھن کچھ بھی نہیں  
 شمع، پروانہ، دھواں کچھ بھی نہیں

سوج لوں باز کر دل درنہ کر دل!  
 شیشہ و نگاں کی جنذکار سنوں  
 آج کیا کہتے ہیں عنخوار سنوں

اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا  
 اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا

# عمرہ مالا

میں ترے خندہ پیپاک سے پہچان گیا  
 کہ تری روح کو کھاتا سا چلا جاتا ہے  
 لھو کھلا کرتا چلا جاتا ہے کوئی الہم زہرہ گداز  
 میں تو اُس پہلی ملاقات سے یہ جان گیا  
 آج یہ دیکھ کے حیرت نہ ہوئی  
 کہ تری آنکھوں سے چپ پ چاپ برنسے لگے اشکوں کے صحاب  
 اس پہ حیرت تو نہیں تھی لیکن  
 کسی دیرانے میں سکھتے ہوئے خوابیدہ پرندے کی طرح  
 ایک بہم ساختاں  
 دفتارِ دہن کے گوشے میں ہوا بال فشاں  
 کہ تجھے تیری تمنا تو نہیں ہو سکتی  
 آج لیکن مردی با نہوں کے سہارے کی تمنا ہے ضرور  
 یہ ترے گر پر نماک سے میں جان گیا

تجھ سے دا بستگی شوق بھی ہے  
 ہو چلی میئنے میں بیدار وہ دل سوزی بھی  
 مجھ سے ہبھوڑا زل جس پہ بھی مجھوڑا زل  
 نفس خود بیس کی تسلی کے لئے  
 وہ سہارا بھی تجھے دینے پہ کھاؤہ ہوں  
 تجھے اندوہ کی دلدل سے جو آزاد کرے  
 کوئی اندریشہ اگر ہے تو یہی  
 نیرے ان اشکوں میں اک لمے کی نومیدی کا پردہ تو ہو کہیں  
 اور جب وقت کی امواج کو ساحل مل جائے  
 یہ سہارا تری رسوافی کا اک ادر بہانہ بن جائے  
 جس طرح شہر کا وہ سب سے بڑا مرد لیکم  
 جسم کی مزدیشی بنا دے کر  
 بن کے رانق تری تذلیل کئے جاتا ہے  
 میں بھی با نہوں کا سہارا دے کر  
 تری آندہ کی توہین کا مجرم بن جاؤں؟

(ہندوستان - مبدی)

جنوری ۱۹۹۷ء

# محاور

بہتے آنسو کو کوئی روک نہیں سکتا ہے  
بند آنکھوں کے پوٹوں سے وہ رہتے ہوئے، پلکوں کو بھگوتے ہوئے  
خسار کی ڈھلوان پر آ جاتے ہیں

بندتا بُوت سے اک نعش نکل کر جیسے  
منظیرِ عام پر آ جاتے کبھی،  
بندتا بُوت میں میری آنکھیں  
اور آنسو میں مری تشنہ تھنا دل کی نشیں پل میں  
منظیرِ عام پر آ جاتی ہیں،  
شرم کا ان کی طبیعت میں تصاصا ہی نہیں،  
پھیلے صحراء میں بکاروں کو کوئی روکے تو شاید روکے  
حصار میدان میں دریا کو کوئی روکے تو شاید روکے  
گرتے پرست کو ہستی پر کوئی روکے تو شاید روکے  
بہتے آنسو کو کوئی روک نہیں سکتا ہے۔

چھردہی بات — کئی بار کہا دل پر فراخپیطر کھو  
ہوش میں آؤ۔ ارے مرد بنو، مرد بنو!

ایسی باتوں سے مگر  
درد کی لذتِ خوابیدہ بھی جاگ اٹھتی ہے  
میری آنکھوں سے ہر آنسو مری پلکوں کو بھگوتے ہوئے، رخسار کی فحلوں  
تک آ جاتا ہے

اور میں رو ناچلا جاتا ہوں  
کبھی چکراتے گلوے کو کسی بنتے ہوئے دریا کو  
گرتے پربت کو کسی نے رو کا؟  
ہاں مری زیست کے صحراء میں وہ چکراتا گلو لاہی توھتی،  
مری ہستی کسی بنتے ہوئے دریا کی طرح بُھتی رہی  
مری راحت کسی گرتے ہوئے پربت کی طرح اُر کے مٹی  
اور مرے دل کو تیر دکی اک لذت بیدار نے یہ ہوش رکھا  
دیکھتی آنکھوں مرے سامنے چکراتا گلو لا آیا  
دیکھتی آنکھوں گیا  
دیکھتی آنکھوں ہر اک بات ہوفی  
ہاتھ پھیلا گئے اندر ہے بھکاری کی طرح  
آج بھی راہ پر میں ملبوچا ہوں  
بندتا پوت ہیں آنکھیں میری!

(مہندوتان مبینی)

میرا جی  
(پ، ۱۹۷۲ء)

# مجُوری

یہ حکمتی آنکھیں، یہ تر شے ہوئے لب شعلہ کار  
 یہ دیکتے گال، یہ شاداب چھولوں کی بہار  
 کیفیت بر دوش جو بن کا نکھار  
 ہوئے میں تیری میہم خاشی کے سائے میں اش رسا  
 اپنی پر کاری سے تو جس کو سرا ہے گی کبھی  
 تیری مجُوری اُسے چاہے تو چاہے گی کبھی  
 رہ سکے گا حسن کا یو نہی وقار  
 جانتا ہوں درست کیوں لیں درہی ہے آج تو یوانہ دا  
 تجھ کو جانا تھا مگر یہ آخری صورت تھی کیا  
 اور توجہ بات سے خالی حسیں مورت تھی کیا  
 کیا نہ تھی اب تجھ میں تاب انتطا  
 تیرے اپنے نے کیا کیوں تجھ کو تیری موڑ سے یوں بکانیا

کیوں انہوں ناشناس اے جنول سمجھا تجھے  
 اپنی تاکامی کے آگے سرگموں سمجھا تجھے  
 یتیرے احساسات کا ان پر مدار  
 شمعِ آینہ کہن پر آہ یہ جب دن ترا پر وانہ دار  
 یتیرے سینے میں بھی پل سکتی ہے دنیا چاہ کی  
 سختیاں تو بھی تو سہ سکتی ہے سوز آہ کی  
 کیوں انہیں آیانہ اس کا اقتبا  
 حسن زمکیں تر کی خوشیں حسن زمکیں کو نہیں کیا زیبہا  
 یتیری فلت اور یوں جبر و رضا کی بندشیں  
 تو نے کیوں چاہی میں خود بے جا جیا کی بندشیں  
 دشمن ہوش و خرد ہے یہ شعار  
 وقت باقی ہے ابھی کچھ اب جنکی کمہرے نہیں "بس ایک"

قیومِ نظر  
 (پ ۱۹۷۲ء)

(ادبِ لطیف لاهور)  
 جنوری ۱۹۷۲ء

# نادانی

رات تہباہی سہبی تکم نہ سہبی  
 ابھی مخلل تو جھبی ہے ابھی جہتاب تو ہے  
 ابھی نپوں سے لگی جھانک رہی ہیں کنہیں  
 لہر بایسا تے ابھی آتے نہیں  
 گوئشہ باغ میں ستانے کو  
 دامن سرو میں سوچانے کو

چاند سے کھیل رہی ہیں راہیں  
 گھاس میں جھپکے پہنچاتی ہوئی لہرائی ہوئی  
 سمٹی مٹائی پلی جاتی ہے اک پلڈٹمدی  
 اپنی عربانی پرشماری ہوئی۔

بید کے سایوں سے بچتی ہوئی بل کھاتی ہوئی

کنج مکشنا سے ابھی آئے گی کوئل کی صدا  
تھر تھرا جائے گی فطرت کی نگاہ  
کنج مکشنا سے جب آئے گی صد  
کون رد کے گا اسے!

ہانپتے ہانپتے سو جائیں گے لاکھوں احساس  
رات تہاہی سہی تم نہ سہی  
ابھی تپوں سے لگی جھانک رہی ہیں کنیں  
راہ دیران ہے دیران سہی  
کوئی نادان سہی

الطاں گوہر  
(پ، ۱۹۴۳ء)

دہندوستان میبی )  
جنوری ۱۹۴۲ء

# بے بی

ایک بے کیف شام کے بس میں  
 ریگنے ساتے اونچتی رہیں  
 چند سوئے ہوئے چھے اور میں

زندگی زنگ دبو سے بیگانہ  
 سرگوں، دل گرفتہ اور اس  
 آہ وہ اس کے قہقہے اور میں

چاہتا ہوں گزر سکوں اک بارہ  
 آرزوں کے حسیں تناول سے

ہوں جہاں لاکھوں چھپے اور میں

نہ سیس میں ہو نغمہ ناہیں  
غایک پا ہو مری بہار بد و شش

بے سماں جلو داں رہے اور میں

دل ناکام کی تن آسافی  
خندہ زن ہے مرے ارادوں پر

درستہ در پیائے غم بھے اور میں

جانے یونہی رہیں گے اب کتبک  
رینگتے سائے، اونچتی راہیں

چند سہے ہوئے پھے اور میں

# دیدہ نیلگوں

دیدہ نیلگوں سیہ پلکیں!

بھیل پر ایک سایہ دار و خست

خواگوں سائے میں کنول کو لئے  
ملکی ہلکی سی نیند سے کھیلے

میرے پہلو میں دل ترستا ہے  
دیدہ نیلگوں سیہ پلکیں!

پھول زگس کے خار دار کر خست

اک چھپھن ایک چیخ ہلکی سی  
داستانیں جنوب تھامہ ہونی  
میری انکھوں سے حوال بنتا ہے

سعید احمد اعجاز  
(پ، ۹۱۲ھ)

ہایل لاہور  
فرودی سلسلہ

# زندال

میرے زندال، مرے اس جدید سنگیں کو محیط  
 دیکھو وہ کھڑکے پر دئے وہ دھوئیں کے بادل  
 ناتوان نظریں انہیں پار نہیں کر سکتیں  
 یہ دھنڈ لکے یہ خنک سایوں کے میلے آپنے  
 قہقہے گونج کے لہراتے ہیں ان پر دوں پر  
 قہقہے۔ زرد سے مرغولے ہلکائی گنگن  
 میری زنجیر دل، مری ٹوٹی نظروں کی پکار  
 اور یہ سامنے لہراتا چکتا دامن۔

مسکانے میں بھی اک بات ہوا کرتی ہے  
 مسکلaci ہو؛۔ بصد شوق کہ میں جانتا ہوں

میں سمجھتا ہوں، سمجھتا ہوں کہ یہ دیواریں!  
ان کی تعمیر میں کیا راز ہے پہچاننا ہوں  
کتنے نازک ہیں یہ محصول، یہ خاموش سے لاتھ  
اُنگلیاں! جیسے شگوفوں کے سہری سائے  
انکی پوروں پر کہیں کوئی نشان ہے نہ خراش  
اور زندال کی یہ تعمیر! - یہ زندال! باعث

میں جب آیا تھا تو بے رنگ تھی تصویرِ حیات  
فاش کر سکتا تھا اسرار و رموزِ فطرت  
توڑ سکتا تھا چمکتے ہوتے ذردوں کا سکوت  
پھاند سکتا تھا یہ دیواریں - مگر یہ علمت!

تم نے جب زلفوں کی پُرپُریج گھنیری تانیں  
میری آنکھوں پر صرے چہرے پر بکھرانی تھیں  
میں نے اُن صدیوں کو تلووں سے مسل ڈالا تھا  
جو مرے سامنے تصویرِ بیت لا لائی تھیں

آج وہ کہر کے پردے، وہ وھوئیں کے بادل  
 میری نظر دل پہ منڈلتے ہوئے منڈلاتے ہوئے  
 پھوس کر نور کے شعلوں کو بھڑک اٹھتے ہیں،  
 میری مجسی بُر زگاہی پتھر ڈھاتے ہوئے  
 لیکن اب تو چکار مریں باہوں کا طسم  
 میرے زندال کی یہ دیواریں نہیں رہ سکتیں  
 اب مراعزم ہے فولاد کی مضبوط چٹان  
 اب پہاں کا نج کی نواریں نہیں رہ سکتیں  
 اب میں خود آگ ہوں، مر شے کو جلا سکتا ہوں  
 مجھ سے اب ہاتھ اٹھا لو کہ میں جا سکتا ہوں

یوسف نظر  
 (پ، ۱۹۱۵ء)

۱) ہمایوں لاہور)  
 فروری ۱۹۴۲ء

# کے نام

سرد بھیگی ہوئی ہوا ذل میں تیرے اپنے کی سلوٹوں کے شان  
 کے ساتا ہوا آگدا ز بدن نرم جھونکوں میں شعلہ لہذاں  
 چاند فی رات کے حسین رائے  
 پھر تری یاد ساتھ لے آئے  
 کالی کالی حسین انکھوں میں دل کی بستا بیوں کے افانے  
 ساقی ماہر و کے آنے پر جاگ اٹھتے میں جیسے پیکارے  
 آسمان کے یہ پرسوں تارے  
 اب تو دل کے لئے میں انگھائے  
 میں نے سرما کی سختیاں حسیلیں سرو قہبہ طوبیل راتوں میں  
 ان کے لچکوں سے نرم بانہو پر رات کٹھی تھی بالند باتوں میں  
 اٹھک آنکھوں سے بہتے جانتے میں  
 زرود قہارے جھلکلاتے میں

سردار انور  
(پ، ۱۹۲۳ء)

۱۹۲۳ء  
مارچ

# یاکس

دل نا کام میں دو شیرہ تمناؤں کا رقص  
 ڈوبتی کشستی میں چند اور سوار آئے ہیں  
 دائم گرداب بلا۔ دور می ساحل طوفان  
 بیسری امید۔ مرار حستِ سفر

پھر فضا پر ہے مجیط  
 یاس کی بڑتی۔ امند تی ہوئی گھنگھور گھٹا۔  
 کھنکشاں ڈوب گئی  
 تھم گیا رقص تمناؤں کا

حداد راک سے دور  
 دُور اس کشمکش سیجم سے  
 ساحل اک دُھنڈے سے خاکے کے سوا کچھ بھی نہیں

# آناؤ تسر

سُخ بُتی نے اشارے سے کہا ہے۔ بولو!  
 کھونج نظروں کامٹا، بات کے بندھن ٹوٹے  
 میرے الغاظ کو ”لہر دن کا کوئی پہمایا نہ“  
 چین لے جائیگا، دوری کے بہانے جھوٹے

منہ سے جو نکلے، اسی بات سے ناطہ ٹوٹے  
 دل میں باقی رہے موسوٰ مسام احساس نیاں  
 میں یہ سوچوں کہ میرا ک دش تھی آبادی بھی!  
 میرے الغاظ کی تشریف کا دیکھے گی سماں!

اور بے نام و نشان، دیکھی نہ بھالی لہریں  
 عالم عالم میری باتوں کا دھنڈو را پیڑیں

محمد از صمد افغانی  
 (پ، ۱۹۱۹ء)

(ب لاہور)  
 اپریل ۱۹۸۳ء

# ساتے

چاند نی رقص کیا کرنے ہے جن پریستہ دل پر  
 آں کے پتوں کے تلے سمجھے ہوئے سایوں کو  
 موت کے کانپتے بڑھتے ہوئے باخنوں کا لمس  
 خوف سے پیرین چاک بن دیتا ہے،  
 یہم کا نرم سکون فام سمشدر جیسے  
 ایک ہی موج سے لمبائی کے چھلک جاتا ہے  
 ایک ہی جھونکے سے یہ سمجھے ہوئے ساتے بھی  
 کسی وحشی کا گریبان درین بن کر  
 نور کے سینے پہ بسل کی طرح لوٹتے ہیں  
 گنگا قی ہے شگونوں کے دو تارے پہوا  
 چاند نی رقص میں دم توڑتے ٹھنڈے ساتے

کون ان کا لے لیتھیمیوں کا بھلا غم کھائے

چاند کی کرنہ میں، فرنگی کی یہ دو شیر آئیں  
اپنی گدراتی ہوئی با نہوں پہ اڑاتی ہیں  
اپنی زلفوں کو حسیں شانوں پہ بکھراتی ہیں

بھوکے زنگی کے سینے پھے — فلاکت کے لغوش  
کا نیپٹے سائے، بلکتے ہوتے، ہجلاستے ہوتے  
ایک ہی جھونکے سے آپس میں لپٹ جاتے ہیں  
اور اپنوں ہی کی تلواروں سے کٹ جاتے ہیں

بھوک آگتی ہے مزاروں کی سیہ مٹی سے  
خون آنہ دسیہ مااضی کی بے حس لاشیں  
بھوکے سایوں کو ستم دیتی ہیں — مردہ مائیں  
گوکھ سے زندہ لیتھیمیوں کو مائل دیتی ہیں،  
چاند کی کرنہ میں — فرنگی کی یہ دو شیر آئیں

رقص میں محو، سلطی ہوتی ان سایوں کو  
گنگنا تی ہیں نئے گیتوں، نئی تاؤں کو

مغلسی سینہ تاریک سے پیدا ہو کر  
رات بن جائے گی، افلاک پہ چھا جائے گی  
چاند کی کرنیں پلٹتے ہوتے سائے کی ردا  
وقت کی ہونکتی ظلمت میں اتر جائیں گی  
بھوکے زنگی کے سیہ پتھے — یہ ننگے سائے  
امہیں کہ فول کا لہو چوس کے لہرا بیس گے  
ادر پر چمکی طرح دہر پہ چھا جائیں گے

یوسف ظفر

(پ ۱۹۱۳)

(جدید ادب فیض آباد)

اپریل ۱۹۲۴ء

# دھوپ کے ساتے

شام دلہن کی طرح  
 اپنے رنگوں میں نہایت ہوتی، رشماقی ہوتی بیٹھی ہے  
 گوشہ پشم سے کا جل کی سیاہی ابھی آنسو بن کر  
 بنتے غازے میں نہیں جذب ہوتی  
 ابھی کھوئی نہیں بالوں کی دل افرادہ پر لشائی میں  
 مسکراتی ہوتی سینہ در کی مانگ  
 گھلتے رنگوں میں ابھی کاشش جاں باقی ہے  
 گھلتے رنگوں کا کوئی کیا جانے  
 کب میں، کیسے میں  
 شب کی نار پکیاں پرست بھر جائیں تو آرام ملے  
 یہ پمپکتے ہوئے فرے نہ رہیں  
 ذوقِ تماشانہ رہے  
 کوئی تماشانہ رہے

راک کرن جچوڑ کے جاتی ہی نہیں  
 چشمکیں کرتی ہوئی کھیل رہی ہے اب تک  
 زرد دم دگھاس کے سینے پر تھر کتی ہوئی بڑھ جاتی ہے  
 سنگریز دل کی نگاہوں میں جمکرتی ہوئی کوت آتی ہے  
 کوئی سمجھا کے اسے "جاوِ چلی جاوِ یہاں اب کیا ہے"  
 دھوپ کے کان پتے سایوں کو فراہٹھنے دو  
 شب کی تار پکیاں جچا جانے دو  
 میں نے سو بار کہا ایک نہ مانی اُس نے  
 مردگاتی ہوئی شاخوں پر لئے تی ہی رہی  
 یوں بھتی تڑ پانے میں اک لطف تو ہے، سوز تو ہے  
 رہگر گھلتے ہی گھلیں گے آخر  
 گھلتے رنگوں کا کوئی کیا جانے  
 کب میں، کیسے میں،  
 اپنے زنگوں میں نہایت ہوئی، شرمائی ہوئی  
 شام دہن کی طرح بیجھی رہی، بیجھی رہی

# رائک اور پریاک

آتے

نرم اور نمازک ساتے  
اوپر کھا اونکھ کر مسلکی خوشبو  
رینگ رینگ کر جا گا جادو

ذہن نے پرچھیلائے

نرم اور نمازک ساتے  
آتے اور لہراتے

کیسے مانوں بہت گئے اب  
غمگیں، تلمخ زمانے؟  
میں جانوں سب گیت گئے اب  
گئے مجھے ترہانے

ذہن کے پر چھیلانے

ذہن نے پر چھیلائے

آئے

او محبل بوجحل سائے

مٹاگہ بتی کا جادو

نظر نظرتے بدلا پھلو

کون کسے پہچانے؟

بوجحل بوجحل، گیت کی بھریں

کون ترا نے گائے؟

او محبل او محبل وقت کی لہریں

کون نظر درد رائے؟

ایک انڈھیرا، ایک معمٹا، ذہن تکے منڈلائے

حجت  
(پ، ۱۹۴۷ء)

(کتاب - لاہور)  
جن ۱۹۴۷ء

# ریت کی لہریں

ہر ایک کمرہ ہے گرد غبار کا سکن  
 ہر ایک گوشے میں سو عنکبوت بستے ہیں  
 ہر ایک شمع کی لوتھر تھراہی ہے ابھی  
 ہر ایک قمچے پر رات چھارہی ہے ابھی

خیال لوٹا ہے سیراب زنگ دبو ہو کر  
 تری رفاقتِ خلداً فرس کی بات ہے کیا!  
 نظر نظر متنفس، نفس قفس بنیا۔  
 بس ایک صبح مسلسل تھے ردزوش بہم کو  
 تصوّرات کی لہر دل کو وقت کے لغے  
 پکارتے تھے کسی خواب گو کے لمحے میں  
 حیات اٹھتی تھی، چلتی تھی مخواب وہ کی طرح

طلسم بندھتا تھا، بندھو بندھ کے ٹوٹ جاتا تھا

طلسم بندھتا ہے، بندھو بندھ کے ٹوٹ جاتا ہے  
 اور سر سلسلہ روز و شب کی کڑیاں ہیں  
 حیات۔ وقفہ کوتاہ۔ چشم متنقیل  
 نہ ہال ہے نتے انسان کی آرزو میں ابھی  
 بدل بدل کے بھی انسان ابھی بدل نہ سکا  
 تصورات میں ہر چند ہیں نئی لہریں  
 مگر یہ لہریں ابھی تک میں ریت کی لہریں  
 ابھی نہیں ہے شناسانی ان کو طوفان سے  
 توہماں کی بستی ابھی نہیں دیراں  
 ابھی تک اس میں دایمیت کے بھوت بنتے ہیں  
 ہر ایک کمرہ ہے گرد و غبار کا منکن  
 ہر ایک گوشے میں سو گنگبوبت بنتے ہیں

اجمِ رومانی  
 (پ، ن۱۹۲۷ء)

(ہمایوں لاہور)  
 جون ۱۹۴۳ء

# آرزو کا طہیل

رات کی حمومشی میں کامنات روئی ہے چاند اس کی کرنوں کا آبے موئی ہے  
 میٹھی نہیں سوئے ہیں زندگی کے ہنگامے وقت دمکاتا ہے حال کا علم تھا نے  
 ایک مریں بد لی چاند کے قریب آئی چوتھے ہی لباس کے مسکن افی الہاری  
 یاد کے درج پھول میں کانپنے لگا ماغی میری نیز سانسوں میں ہانپنے لگا خاہی  
 ابر کے گریباں میں تارہ جھبلہ ملا یا ہے ذہن میں دبے پاؤں جانے کوں آیا ہے

روئی روئی انکھوں میں سوئی سوئی مستی ہے خلد کے جزر پر دل پڑنہیں سی بستی ہے  
 دھیر سا ہے ثانوں پر کھربے بکھرے بلوں کا اک غبار سا جیسے رُوح پر خیالوں کا  
 نظر کی ایجادت پر تہونٹ پھر پھر اترے ہیں جیسے نہ مجنونوں سے چھوپ کانے پر ہیں

معبدوں کی محرابیں، اسکے باز و دل کے غم جوئے آب میں تائے، اس کے دیدہ پر نہ  
 گاہے گاہے کچھ ایسے قسم کے لذکھڑاتی ہے  
 جیسے نیم کی ڈالی جھول جھوم جاتی ہے  
 عالم جوانی میں کتنے خواب دیکھتے تھے جن سے بھر شرایپیں وہ سراب دیکھتے تھے  
 کتنے بوستاں سنبھے کتنے بن سائے تھے۔ آنسو دل کے تاروں سے آسمان سمجھا تھے  
 اک نیلام کی وھن ہیں ہر ہر ہر چنانچیں اک اڑان میں کتنی جلوہ گاہیں پھانپتیں  
 قیمعتی سے گونج اٹھج بنا کشزادو و بک رہ گئے سائے دلے ارادوں کے  
 بجلیوں کے اپواں ہیں آگ کے بھچپنے میں  
 آرزو کھلاڑی ہے۔ آدمی کھلونے ہیں

احمد ندیم فاسقی  
 (پ، ۱۹۱۴ء)

(دہمایوں - لاہور)  
 جولائی ۱۹۳۵ء

# آنکار

نگاہیں تتما اٹھیں، دہن شرہ فشاں ہوا  
 میں پارہ پار کہہ چکا  
 نہیں، نہیں، نہیں، نہیں!  
 بتا بجھے اسی صورتی پہ اپنی ناز ہے؟  
 تیرا یہ سحر زنگ دبو! !  
 اسی کی قید میں ترمی حیات گھٹ کے رہ گئی  
 وہ شو خی قلم کہاں! !  
 وہ حُسن پنج خمسہ کہاں! !  
 ہزار دل نقش تونے اس سے خوب تر بنائے ہیں  
 یہ تیرا شاہ کار ہے؟ !!

غلک بھی سرنگوں ہوا  
 زمیں بھی تھر تھرا گئی  
 جیں خود نگہ مگہ نہ جھک سکی، نہ جھک سکی  
 بجھے کسی کا پاس ہے؟ — نہیں!

یہ آسمان؟ — نہیں!  
 مکان ولا مکان؟  
 نہیں!  
 یہ زندگی؟  
 نہیں! نہیں!  
 ہزار بار کہہ چکا  
 نہیں، نہیں، نہیں، نہیں!

فرازِ آسمان سے اک ستارہ ناگہاں گرا  
 یہ اون بے بسی نہ تھا  
 یہ جدوجہدِ نسبت تھی  
 زمیں نے اپتے اشک پوچھ کر کہا  
 نہیں! نہیں!  
 عذر یہیں آئیں کوہ و دشت سے  
 نہیں، نہیں، نہیں  
 فضائیں گوئیں لگیں  
 نہیں، نہیں، نہیں، نہیں —!

# چاکتے کا خواب

جی میں ہے کہ لگ شستہ لگا ہوں کو بلالوں  
 پھر حب نظر آج تصاویر بینالوں  
 یہ ذہن کا فذ کار ہے پیغمبر تکیں

وہ شیش محل ہے میں یہاں آتا ہوں اکثر  
 چاہوں تو۔ پر ہی چہرہ کنسیزیں بھی بلالوں  
 وہ آگئیں باختوں میں لئے شیشه و ماغرا

وہ سامنے جو ہڑکے میں سسان کنارے  
 چاہوں تو۔ کوئی لگا دل کی وڈیسیزہ بلالوں  
 وہ آبھی گئی۔ آتے ہی کپڑے بھی آتا رے  
 وہ پھینٹے اڑے اُس نے خدو خال نکھالے

وہ سامنے کھڑکی سے کوئی جھاٹک رہی ہے  
 چاہوں تو اس "آفت" سے ابھی بیاہ رچاولی!  
 وہ میری دلہن پھولوں سے گہنیوں سے لدمی ہے  
 شہناقی کی نانوں سے مغلی گونج رہی ہے

ذرت کے کشمکش تختیل کی اڈائیں!  
 ہر ہر نفسِ زیست ہے آدینہشِ تاذہ  
 راہوں میں اُبھر آتی ہیں مضبوط چٹائیں  
 کھینچتی نہیں کھینچے سے خیالوں کی کمائیں!  
 ظلمت میں غنیمت ہے سحر دیکھ رہا ہوں  
 ہر زنگ کی فردوسِ نظر دیکھ رہا ہوں  
 مضبوط چھانوں کے اُدھر دیکھ رہا ہوں

# دُنیا

بُوڑھا پنوڑی۔ اس کے بالوں میں مانگتے ہی نیاری  
 آنکھوں میں جیون کی بجھتی اگنی کی چنگاری  
 نام کی اک ہٹی کے اندر بوسیدہ الماری  
 آگے پینیل کے تختے پر اس کی دنیا ساری  
 پان کتھا، سکرٹ، تمباکو، چونما، لونگ، سپاری

عمر اس بُوڑھے پنوڑی کی پان لگاتے گزدی  
 چونا گھولتے، چھالیا کاتے، کتھ پھلاتے گزدی  
 سکرٹ کی خالی ڈیبوں کے محل سجاتے گزدی  
 کتھ شرابی مشتریوں سے نیں ملاتے گزدی  
 چند سیدے پتوں کی گتھی سبھاتے گزدی

کون اس گتھی کو سلبھا نے؟ دنیا ایک پہلی  
 دو دن ایک بھٹی چادر میں دکھ کی آندھی جھیلی  
 دو کڑوی سال میں لیں دلپول کی راکھا ندی  
 اور پھر اس کے بعد نہ پوچھو کھیل جو ہوئی کھیلی  
 پنوائی کی ارتھی صلحی — بابا، اللہ بیلی!

صیح بھجن کی تان منو ہر جھن جھن لہرا نے  
 ایک چتا کی راکھ ہوا کے جھونکوں میں کھو جا نے  
 شام کو، اس کا کس بala بیٹھا پان لگا نے  
 جھن جھن بھن بھن چونے والی کٹوری بختی جائے  
 ایک پینگا دینکپ پر جل جائے، ووسرا آئے

مجدیداً مجد  
(پ، ۱۹۱۲ء)

(ادبِ لطیف لاہور)

جنایی ۱۹۶۳ء

# نیا مکان

چلو مرکاں کی مصیبت سے بھی نجات ملی  
 یہ خواجہ ، یہ کھن ، غسلخانہ اور بیٹھک  
 میں سوچنا ہوں مجھے سوچنے کو بات ملی  
 ہوئی ہیں صرف مشقت کی کوششیں تھک  
 نظر بادر و دیوار کے بنانے میں  
 یہ قیمت ... یہ تمدن کی اختراق جدید  
 بڑھی جلالت اور اک تیرگی نہ مٹی  
 یہ سیر ہیاں میں زگا ہوں کے یہ سچ کی منظہر  
 حیات کی کوفی پھیپھیدگی نہ دُور ہوئی  
 مگر میں خوبیوں ادبار کے مٹانے میں

یہ سیڑھیاں ہیں اگر ان سے گئ پڑپے کو نی  
 بُرمی گھری نہ خدا لائے جانے کب آجائے  
 یہ چکنا فرش اسے دیکھتا رہے ہے کو نی،  
 جو کل کو پادن تمہارا کہیں چل جائے  
 خدا کرم کرے... میرا تو وہم نکل جائے  
 میں سوچتا ہوں مجھے سوچ کا بخوبی جو ہوا  
 یہ میرے ذہن کا ماحول پُر فسوں جو ہوا

یہ میرا ذہن مجھے لے چلا ہے دُور کہیں  
 ڈال جہاں کجھی پہلے بھی نہ تھا مرکان اپنا  
 فلک کے سائے میں سہم تھے کبھی نہ پا گئیں  
 یہ فرشِ خاک تھا قایینِ زرفشاں اپنا  
 یہ مہر و ماہ یہ تارے تھے اپنے گھر کے دیتے  
 گل و گیاہ سے لبر نیز پُر بہار نہ یہیں  
 جلو میں حُسن لئے دعوتِ نظر کے لئے

کبھی ہمارے لئے بخوبی تھتست گا وہ سین  
 یہ زلف پسچ سے بیگانہ مونج صہبایا بخوبی  
 کہ جس کو برسوں مری انگلیاں رہیں شانہ  
 یہ تیری ہمد می اک کیفیت تھبھی تھے بخوبی  
 جہاں بھی چاہنا نوراً وہیں چلے جانا  
 وہ صبح ساحل وریا... وہ شام زیر چنپا ر  
 گذر گئی وہ مسترت کی صبح و شام اپنی  
 ہما سے دوش پر چب تھا نہ سبز و قدر کا بار  
 چلو چلو یہ حکایت ہے تلخ نکام اپنی  
 انھوں انھوں دیوار کو سجنانا ہے  
 مکان کو گہنوں لدمی اک دلہن بنانا ہے

# آمنا سامنا

بیتے لمے یاد آتے ہیں ملکی ہلکی خوشبوؤں سے  
 دُکھ ہیں دل کو بر ماتے ہیں و نیستہ اکے جھونکوں سے  
 طوفان سا دل یہ لاتے ہیں کھوئی کھوئی کچھ یادوں سے  
 ان یادوں سے خوشبوؤں سے کچھ زرم ہوا کے جھونکوں سے  
 بیتے لمے یاد آتے ہیں  
 جیسے مٹا سہمٹا کا جل یوں جھانکتا ہے ان آنکھوں سے  
 گر رنسے لگا تو سامنا ہو گا گوئے گوئے گالوں سے  
 پھراس کی سیاہی بڑھ جائیگی کار کار کالے یادوں سے  
 ان گورے گوئے گالوں سے ان یادوں سے ان آنکھوں سے  
 کا جل کے درے درتے ہیں

ماضی کی آنکھ میں سمجھے رہیں کہہ دے کوئی بنتے لمحوں سے  
 کیوں کھلتے ہیں کیوں پھیلتے ہیں لختہ صورگھٹا کے بالوں سے  
 نسبت نہیں انکو کسی سے کوئی یہ حکایہ ہیں ان جیوں تے  
 جو اشکوں کی کرنوں کے سماں تے تاریکی کے رستوں سے  
 خاموشی بی میں گزرتے ہیں  
 سچھے سچھے کیوں نہتے ہیں لوچھے تو کوئی یہ اندرھوں سے  
 جیسے کچھ بلدے ٹوٹتے ہیں دریا میر محلتی لہروں سے  
 ایسے ہی بھیدل آتے ہیں دل میں سونی یادوں سے  
 اور اندرھوں کے دل میں یادوں کی آنکھیں کھولتی لہروں سے  
 ہم جی انہی سے بن جاتے ہیں

---

میراجی  
 (رپ، ۱۹۱۲ء)

(ساقی - دہلی)  
 اگست ۱۹۴۷ء

# تقلید امراء ایام

رات پھر کالی ہے امید نے آنکھوں میں مردی  
 رات پھر جاگا ہوں میخی عیادت کے لئے  
 آئے مرے نورِ نظر! تیرخی خط اس میں نہیں  
 میں ہی مجرم ہوں کہ افلاس کے اس دنخ میں  
 میں نے اعداد کی تقدیم کو ادا کر لی،  
 میں نے اس نارِ جہنم میں بُلا دیا تجھے کو  
 یہ جہنم کہ جہساں چھوٹی ہیں انگارے  
 یہ جہنم کہ جہساں اُگ کے بستر ہیں بچھے  
 یہ جہنم کہ جسے سرد نہیں کر سکتے  
 کسی نادار جوانی کے بلکہ آنٹو۔  
 میں نے اُک تیرتے میسم کی مسترت کے لئے  
 تجھے اس نارِ جہنم کا نزاذار کیا  
 میں خطدار ہوں، مجرم ہوں، ترا مجرم ہوں  
 میرے آبائے یہاں سانپوں کو سونپا بھاٹجھے

پچھوؤں نے مرے ہر ایک فتادم کو چوڑا  
 آسمان نے مری انکھوں میں وصواں جھینوں مکدیا  
 میرے ما حول نے دیواریں اٹھائیں ہر سو  
 آہنی رسموں کی تیزی ہولی دیوار دل سے  
 میری محنت، میری کاوش نے بچایا تھا مجھے  
 میں نے اس رزم کے محنت و سرما یہ میں  
 سرد فاقروں کی زرہ پہنی تھی افلاس کا خود  
 اور لڑتا ہوا کچھ حبیت اتنا، کچھ پارا تھا

پھر سہارا ملا، اک ایسا سہارا جس نے  
 میری گردن میں دعاوں کا جو اڈال دیا  
 ایک موت اور۔ مگر میں نے خریدا تھا اسے  
 میں نے اجداد کی تعیینہ گوارہ اکی تھی  
 ایک ہوت اور۔ تجھے میں ہی یہاں لایاں ہوں  
 اُنہیں اجداد کی تعیینہ میں لایا ہوں یہاں  
 کہ مرے نام کا لیوا ہو کوئی دنیا میں  
 کہ اُجالا ہو مرے گھر کا، بڑھلپے کا چراغ

مگر اے نورِ نظر فاقوں کے اس دوزخ میں  
میں وہ انڈھاتا کہ ٹھوکرنے سنبھالانہ مجھے  
تجربے سے بھی مری راہنمائی نہ ہوئی

مجھے محنت سے نہ قسمت سے ہے کوئی امید  
اور سرایہ کے آپ بقاویت ہے  
کالا ڈستا ہے اُسے ڈسنا ہے لبیں ڈسنا ہے  
مجھے منظور نہیں میری طرح تو بھی یہاں  
غم بھر مرتا رہے رفتار ہے مرتا رہے  
ذہن میری طرح پابند سلاسل ہو تو ا  
تیری تختیل بھی مغلونج رہے عقل بھی خام  
تیرے گاؤں پچنور پڑتے رہیں میری طرح  
تیری آنکھوں کے اُجائے سے تاٹے ٹپکیں۔

آمرے لاٹے آبا آکہ ترا منفلس باپ  
تیرے اس رسمیں حلقوم پنجھر کھدوے  
مسکرا بیٹھے! — مرے لاٹے میرے پیارے

یوسف ظفر

(پ، ۱۹۱۲ء)

(ادبی دینا۔ لاہور)

اگست ۱۹۳۷ء

# جھونکا

ہوا کی ایک موج پھر قریب سے نکل گئی  
یہ رات کا خمار تھا کہ اڑکھڑا گئے قدم؟

ستارے ناچنے لئے  
فضائیں جگمگا اُجھیں  
نظر سے چھپ پٹھی زمیں  
اُفق کی جستجو لئے ہیں ایک بھر بے کنار میں بہا چلا گیا

ہوا کی ایک موج پھر قریب سے نکل گئی  
یہ آسمان نیلگوں یہ سرپاند چوٹیاں  
یہ شاخیں اور یہ کنوں  
یہ رنگ بادہ شفق

صلائے ہم دے رہے ہیں پہلے شوق کو  
 نظر اٹھانی کہہ دیا ہے میں ہی چانتے ہیں ہم  
 اگر فراسا شک بھی ہو تو آذما کے دیکھ لو!

ہوا کی ایک موج پھر قریب سے نکل گئی  
 میں اس کو کاش چھوکوں!  
 ہوا کا اعتبار کیا؟ کبھی یہاں کبھی وہاں  
 ابھی وہ آئی ہاتھ میں، ابھی وہ پھر چپل گئی!  
 چمن سے بچوں چن لئے  
 جکہ میں پیش خار کی خلش مکر نہ سہہ کی  
 ہوا کی ایک موج پھر قریب سے نکل گئی!

میثب الرحمن  
 (اپ، ۱۹۷۲ء)

(سمایوس لاہور)  
 الگت سجن

# مفارقت

وہ راستہ ابھی ادھر تھا اور اب دھرم بست ہی دُور دُور دُور سی چلا گیا  
 اسی طرح ہر ایک شے قریب آ کے ایک پل کو رکھتی ہے  
 مگر وہ رکنا ایک پل کا ہے اُسے

بھیشہ کے لئے زگاہ سے بہت سی دُور دُور دُور جاننے کے  
 وہ ایک بات ایک نقطہ کائن کو سُنا فی دے کے دُور سی چلا گیا  
 وہ اک زگاہ۔ کل کی بات جیسے کل کی بات ہی نہیں  
 خبر نہیں وہ کس حنجم کی بات ہے  
 وہ ایک بات ایک نقطہ اک زگاہ دُور دُور کے لئے ہی آنے نਹیں

ہر ایک سانس ہے بہت بڑا سفر

ہر ایک سانس اک بسیرا ہے کہ جس کا محدود ہی نہیں ٹھکانا ہی نہیں کوئی۔ بھی زمین  
 پہ پھیلے کھیت میں کبھی بہار اور گھاٹیاں  
 کبھی سرگز سے نکل کر ایسے ہے کہ جسے کوئی شے غنیمہ نہ تھی کہیں  
 فقط بکیس ہی اک مسادراۃ ثان سے ابھی یہاں تھا اور اب کہاں گیا خبر نہیں  
 ہر ایک شے کو دُور دُور جاننے ہے

ہر ایک شے کو دُور جانا ہے مگر قریب آکے دُور جانا ہے  
 دُکرند دُور کچھ نہیں، خیال بھی نہیں، نہ وہم ہے،  
 تو پھر وہ شے جو دُور ہی پلی گئی  
 قریب آسکی نہ جو کبھی

وہ ایک شے وہ ایک بات ایک لفظ اک نگاہ کیا تھی، اک چلا وہ تھی؟  
 ہر ایک شے قریب آکے کہتی ہے کہ ایک پل کی راحتیں یہ سانس ہیں  
 اور ایک پل کو جیسے سر سے اوڑھنی سرکتی ہے، ہر ایک شے سر کے دُور جاتی ہے  
 مگر وہ ایک شے وہ ایک بات اوڑھنی تو تھی سرک گئی  
 وہ راحتوں کا مجھ کو اک اشارہ کر گئی مگر قریب ہی نہ آسکی  
 ہر ایک سانس اسی راحتوں کے کھونج میں رداں ہو اجو دُور ہی پلی گیں  
 مگر ہر ایک سانس راحتوں کی گونج ہے  
 وہ راحتیں کہیں نہیں

وہ راستہ ابھی ادھر تھا درا بُ ادھر بہت ہی دُور دُور دُور ہی چلا گیا۔  
 ہر ایک سانس کے لئے بُرا سفر تو آج بھی وکھانی دے رہا ہے پر  
 وہ سانس جس کو آخری کہوں کہیں نہیں

(ہمايون لاہور)  
اگست ۱۹۴۲ء

میرا جی  
(پ، ۱۹۴۲ء)

# تجددید

اور اک صحیح نمودار ہوئی  
 چشم غم دیدہ کی تاریک نگاہی نگئی  
 پلکیں اٹھیں تو نگاہوں کی چمک بیس سائے  
 دفتار جیسے کسی خواب سے بیدار ہوئے  
 ایسی بیدارہ می جو خود خواب کر لے ہو جائے  
 زیست پھر رپرپکار ہوئی

خشک ہو ٹوں پہ بسم آیا  
 حلقة در حلقة اٹھیں سازِ الام کی موجیں  
 جا گئی لمبڑیں کی انگڑا آیاں بنتیاں ہوا راگ

رَأْكُ دَهْ رَأْكُ جَسَے دَلَوَے دَهْ رَاتَے مِيْ  
 كُوفَى كَتَبَتَاهُ كَهَ كَهَ اَبْ خَوَابِ شِيشِ تَارِسِيْ جَأْكُ  
 دِيكَهِ مُوجَوْنِ مِيْنِ مَلاَطِمَ آيَا

شِيشِنَمَ آَوْ دِكَنَوْنَهِ بُخُورَتَهِ  
 دَهْ رَكَنِيْنِ دَلِ كَيْ كَهَ بَاتَتَهِ بَيْنِ دَلِ بَسِ بَيْنِ بَيْنِ  
 آَرْزِ دَيْكُ نَسَنَتَ دَرِ دَكَ آَغَانَهِ تَوَهَّهَ  
 زَنْدَهِ رَهَنَنَهَ كَهَ لَنَهَ كُوفَى سَهَارَاتَوَهَوا  
 دَكَهِ سَهَ بَحَرِ بُورِ سَهِيْ مَسَتَ دَهَرِ سَانَهِ تَوَهَّهَ  
 اَبَهَ رَائِيْنَهَ اَفْسَوْنَهِ تَوَهَّهَ

دادِبِ لطیف لامہر

ستمبر ۱۹۷۳ء

ضیا جالندھری

(پ، ۱۹۷۳ء)

# خیال درباری بہبیت

ان کے کانے میں ہے پر کاش فرا و یکھوت تو  
ایک اک تان سے ہیں نور کے سوتے جاری  
تین صدیوں کے شبِ روز جلو میں یہ کہ  
سیکری لائی ہے گھمیر، سحل درباری

بود دبام میں سادبنت معشل کا پتو ہے ستو نوں کی نفاست سے عیاں سنگیٹی  
اوپنجی محراجوں کے گھرے میں کشاوہ ایوال جس نے یہاں اراد دل سے بلند چھپیں  
اسی ایوال میں ہے اکبر غلطگم کا جلوس  
ان گنست جھاڑ، دلختی ہوئی لاکھوں شمعیں  
خلعیم حنگی ہیں بور کے شفاف باباں!  
اہل دربار خبردار، نگاہیں پیچی! اہل تھرائے  
ہاتھ باندھے ہیں حضور میں ایران کہیں آئی آواز، کہ تشریف شہنشہ لائے  
حضرت گیتی پنه، اکبر غلطگم آئے  
کوئی نظریں نہ اٹھانے کے پاتے  
اکبر غلطگم آئے!

”تر کماں جھرت اکبر آیو!“  
 اُپ بُلی، تپ بُلی، دنیا میں خدا کا سایہ  
 جن کا دم بھرتا ہے، انسانِ ملک چوپا یہ  
 ان کے ہم آپ نہ بل بل جیئے؟!  
 مر نے جینے کا اگر ان سے ”بندھنو ابا ندھو،  
 پار ہو بیڑا کہ ہے“ پسیر ہمارا سانچو  
 تر کماں جھرت اکبر آیو — جھرت اکبر آیو!

### ان ترہ:-

آل تمیور کے سورج کی تحلیلی پھیلی،  
 دکھ دلدر کے گھٹاٹوپ اندھیرے بھاگے  
 وہ آجالا ہے کہ جگ جگ کے نصیبے جاگے  
 ”اے رہی جگ جگ کے نصیبے جاگے!  
 دو بھاں مطلع انوار ہوئے ہیں ویکھو!“  
 تر کماں جھرت اکبر آیو — جھرت اکبر آیو

### پھیلاؤ:- روشنی تیز ہونی

روشنی تیرہوئی شمتوں کی،  
 روشنی تیرہوئی شمتوں کی فانوسوں کی  
 روشنی تیرہوئی شمتوں کی فانوسوں کی اور شب کی دلہن  
 روشنی تیرہوئی شمتوں کی فانوسوں کی اور شب کی دلہن شرماقی،  
 روشنی تیرہوئی شمتوں کی فانوسوں کی اور شب کی دلہن شرماقی الجاگر سہی  
 روشنی تیرہوئی شمتوں کی فانوسوں کی اور شب کی دلہن شرماقی الجاگر سہی  
 انہی شمتوں نے دیا چاند کا جھو مراس کعا!  
 وجہاں مطلع انوار ہوئے، ویکھو تو،  
 ترکاں مجرتِ اکبر آیو — مجرتِ اکبر آیو!

جوت گانے کی بھی بیتے زمانے بھاگے      لکھنچ لیں تین سو برسوں نے طنابیں اپنی  
 قصر دیاں ہیں کہیں یوم کا نوحہ گوئا      سونپیں اگئے اس لفھے کو خوابیں اپنی  
 بیکراں رات سے محراب کی فعت دوں اور پیس سایہ محراب ہیں ہوں افتادہ  
 خشک خندق سے دھر کوہ گراں یوایں اب کہاں جاؤں کہ رہبر نہ شانِ حادہ  
 کس خرابے میں مجھے چھوڑ گئی درباری

فتح آر صدیقی  
 (پ، ۱۹۷۲ء)

(ادب لطیف - لاہور)  
 ستمبر ۱۹۷۲ء

# آدھی رات کو

اب آپ اپنی ہی پر چھا بیس ہیں گھنے اشجار  
 فلک پتہ تار دل کو پہنچ لی جمھا تیال آ میں  
 تینوں یوں کی دکانیں کہیں کہیں ہیں مجھ سلی  
 کچھ اونگھتی ہولی بڑھتی ہیں شاہزادوں پر  
 سواریوں کے بڑے گھنگڑ و قل کی جھنکایں  
 کھڑے ہیں سمنٹے ہوئے ایسے ہر سنگھار کے پڑی  
 جوانی جیسے جیا کی سو گندھ سے بوجھل  
 پاہِ رس ہے اب کتنی دور بہلنے سے؟  
 یہ مویح نور یہ خاموش اور کھلی ہوئی رات  
 کہ جیسے کھلتا چلا جائے اک سفید کنول  
 چھڈا رہی ہے ختم غیب سے، شراب موجود  
 فضائے دہرے ہے اک زخمِ خمسِ را شادو  
 یہ رس میں دبی ہوئی آنکھیں یہ سکول گات  
 نا نکلا س ر حانہ اور ستار دا رکی

کرن کی انگلیوں سے چھتر کے ساز فطرت کے  
ترانے جا گئے والے ہیں۔ تم بھی جاگ انھوں

کنوں کی مشیوں میں بند ہے ندی کا سہاگ  
بہار میں جاگ امٹھا آدھی رات کا جاؤ  
نہ مغلسی سہوت تو کتنی حسین ہے دنیا  
پر جھائیں جھائیں سی رہ رہ کے ایک جھینک کی  
خناک ٹیوں میں جیسے سر سارہٹ سی  
پر سرگوں میں سر شاخ پھول کیدھ مل کے  
کہ جیسے بے نجھے انکارے ٹھنڈے پر جای  
یہ محظ خواب میں زنگیں مجھ پلیاں تہ آب  
کہ حوضِ صحن میں اب ان کی چشمیں بھی نہیں  
قریب چاند کے متدار سی ہی ہے اک چڑیا  
بھنوں میں نور کے، کروٹ سے جیسے ناڑ چلے  
بدل سکے تو پھر اس نندگی کا کیا کہتا  
کہاں سے آتی ہے مدھماں تی نتا کی لپٹ؟  
کہ جیسے سینکڑ دل پرمایں گلا بیاں چند کا یہیں،

گھوول نے چادرِ شبِ نمر میں منہ لپیٹ لیا  
 لبؤں پر سو گئی کلیبوں کی مسکراہٹ بھی  
 چمن میں سنبھل تر کی لٹیں نہیں ملتیں  
 سکوتِ نیم شہری کی حدیں نہیں ملتیں  
 زمانہ کھلتا رڑا نی کورہ گیب ہو گا  
 مرے خیال سے اب ایک نجح رہا ہو گا

گذر رہا ہے اوھر سے کوئی خیال کی طرح  
 سُنانی دینے لگی خامشی کے پاؤں کی چاپ  
 زمانہ دوسرے کروٹ ملنے والا ہے  
 کچھ اور جاگ آٹھاً اوھی رات کا جادو  
 فضائے حصار میں رقصان ہیں جاند کی کنیں  
 کہ جیسے شیشے پہ پڑتی ہو نرم زم پھوار۔  
 یہ مونج عفقتِ معصوم، یہ نہمار بدن  
 یہ بہکی بہکی سی سانسیں یہ انکھیں نیند بھری  
 اب آؤ سینے سے مرے پٹ کے سو جاؤ  
 یہ پلکیں بند کر دا در مجھ میں کھو جاؤ

# وہ

آخر شام ہوئی

ختم سخا سورج کافرانہ  
آنسو کے روشن دکھنے کو

دل ڈھونڈے گا اور بہانہ  
ملنے کی بے چین تمنت  
پھر نا کام ہوئی

آخر شام ہوئی

یہ بدست ہوا

لے آئی ہے یادو کے ساتے  
تھوڑا پہاڑ کے لئے  
لڑنے، لپکنے اور لہراتے

ملکی ملکی موسیقی سے  
ہے لب سر زیرِ فضلا  
یہ پدست ہوا

میں بے خواب رہا  
سی محیں شب کی پھنسائی میں  
گلشن کے گھرے سایوں کی  
سمی سہمی تہرانی میں  
مورج زنگ دبوکی لے میں  
میں بے تاب رہا  
میں بے خواب رہا

محمد خلیل الرحمن  
(۱۹۲۰ء)

(رہماں لاہور)  
ستمبر ۱۹۲۰ء

# سنبھال

تہاں فی رشکستہ پر سعیٹیے  
آکا ش کی وسعتوں پر جیسا  
حضرت سے خلایت مک ہی ہے  
یادوں کے سُلگتے اپر پاے  
افسر وہ وحومیں میں حمل چکنے ہیں  
پہنچنے خیال کے دھنڈ لکھے  
اب تیرہ و تار ہو گئے ہیں  
آن سو بھی نہیں کہ رو سکوں ہیں  
یہ موت ہے زندگی نہیں ہے

اب آئے کوئی مجھے اٹھا کر  
اس اُدھنچے پہاڑ سے پیک دے

ہر ہمت فضائیں چیخ جھیس  
 باول بھی گستاخ گستاخ کے برسیں  
 کوندوں کے کڑکتے نازیا نے  
 لہرائیں گھنی سیاہ شب کے  
 سینے میں کئی شرگاف کردیں  
 تار پکیاں پھر لپک کے اٹھیں  
 آپس میں لپٹ لپٹ کے لرزیں۔  
 اور ٹوٹنے گرتے لاکھوں اشجار  
 کہتے رہیں مجھ سے سنبھلو سنبھلو  
 میں سخت وسیاہ پھر دل سے  
 ملکہ اتا ہوا، رطحکت جاؤں  
 اس سوریں کوئی کہہ رہا ہو  
 یہ موت نہیں ہے زندگی ہے

ضیا جالندھری  
 (تپ، ستمبر ۱۹۴۳ء)

(ادبی دنیا۔ لاہور)  
 ستمبر ۱۹۴۳ء

# بُر قباری

رات بھر برف نجموشی سے گردہ گردی کرتی رہی۔

رات بھر برف ڈھلانوں پر چنانوں پر دنستوں پر گردہ گردی کرتی رہی۔

پھر سکون

نیلگوں نور میں طبوس اٹھا

تیرگی پھر سے امد آفی ہے

ابھی ڈھلوان سے چسلے گی۔ چسلتی ہوئی آئے گی ہوا

چیل کی شاخ سے چھو جائے گی۔

چیل کی شاخ لپک جائے گی

چیل کی شاخ سے ہو لے ہو لے

برف کی پتیاں رک رک کے بکھر جائیں گی، گر جائیں گی۔  
اور دھنڈ لکے کی خمتوشی میں سیہے باول سے  
برف پھر بہتی ہوئی آئے گی۔  
وڈر، تاریک و نحتوں کے تنوں سے آگے  
نیمچاں حسیم سے پیرا ہن صد چاک کو لپٹائے ہوتے  
صحیح کی پیر زدنِ حسن فروش  
کانپتے ہونٹوں سے دیوانی ہنسی ہنسنے کو ہے  
برف پھر گرنے کو ہے

---

محمد صندر  
(پ، ۱۹۲۳ء)

راوی لاہور  
نومبر ۱۹۷۷ء

# چاندنی

بلوٹ کے سبز سبز تپوں پہ چاندنی مسکرا رہی ہے  
 بلوٹ کی اک بلند چوٹی پہ چاندنی کا حسین وہن انگ گیا ہے  
 لخنیرے سایوں کی اوٹ لیکر سکوت بھی سو گیا ہے شاید  
 کہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کی موجود چاندنی سر سر رہی ہیں  
 کتنی بہاریں گزر چکی ہیں کہ چاندنی کا حسین آنجل  
 بلوٹ کے مسکراتے تپوں کے نیچے ڈک کر

بہار کے گیت گارہا تھا

میں دل گرفتہ، اوس تنہا بلوٹ کے پاس کیوں کھڑا ہوں  
 کہ جھولی بھسلکی کرن ہو کوئی جو چاندنی سے بچ پڑ گئی ہو  
 میں چپ ہوں اور رورہا ہوں — تنہا

اعجاز طباوی  
 (پ، ۱۹۲۸ء)

اوی دنیا لاہور  
 مئی ۱۹۲۸ء

# پروجا

میں نے کیا پاپ کیا  
میں نے کیا جرم کیا  
اے بیرے نیلے کنول سے دیوتا!

زگبِ نہ مِ گل و مہتاب کبھی دیکھ لیا  
نینداً فی تو حسین خواب کبھی دیکھ لیا  
نے نواز طربِ زیست! میں یہ بھی نہ کر دیں  
میں نے کیا پاپ کیا  
میں نے کیا جرم کیا  
اے مرے نیلے کنول سے دیوتا! — ۶

گیت اک درد بھی ہے آنا تو سوچا ہوتا

اپنے ناخوں کی فضاؤں میں بھی دیکھا ہوتا  
 میرا جو داع مکھلا، میرا جو آنسو بھپکا  
 خود ترے چاند تاروں نے اسے چھپیں لیا  
 میں نے کیا پاپ کیا  
 میں نے کیا جرم کیا  
 اے مرے نیلے کھنول سے دیوتا۔؟

کتنے نعماتِ محبت کے لئے ساز نہیں  
 کتنی را و حادوؤں کی پازیب میں جھنڈ کار نہیں  
 دل نے بے پربط دبے ساز بھی گانا چاہا  
 آنکھ نے غپتہ غم گیس کو سہانا چاہا  
 میں نے کیا پاپ کیا  
 میں نے کیا جرم کیا  
 اے مرے نیلے کھنول سے دیوتا۔؟

سلامِ محجن شہری  
 (اب کاشم ۱۹۱۹)

(ساقی دہلی)  
 دسمبر ۱۹۴۷ء

# سپاہی کی دہن

مرے سینے میں بھی موجود کا کچھ ایسا ہی ابھار

مجھے سیکل سا بنا دیتا ہے

اپنی دہن سے کہا تھا تو نے

ہنسی سادوں،

اس رادی کے کنارے

اک شام

میں یہ بھی تیرے سینے کی یہ تان،

یہ محنت کی آٹھاں،

ایک سیلاپ ہے رادی کا حریث

ایک طوفان نہ مٹنے والا

آن را و می کا چڑھاؤ ہے وہی  
 ہے وہی اس کی ترپتی ہوئی موجود کا خوش  
 چاند کی سمت بُرھی جاتی ہیں  
 زم ریوں میں دھنسی جاتی ہیں  
 اور تو؟

میری امنگوں کے سنگار  
 کون سے دیں کی ریوں میں چھاپا  
 تیر سیداب بجت  
 تیری موجود کا ابھار

تصدق حسین خالد  
 (پ، ش۱۹۴۲ء)

(کتاب - لاہور)  
 دسمبر ۱۹۳۳ء

# ملاقات

چھوٹ چھوٹ میں امنگ زنگ بن کے جی اُھٹی  
 خوشبوؤں کی لمہر لہر با دلور کے سائے میں  
 راگ چھپڑتی اُھٹی

راگتی کی آنچ شاخ شاخ میں رداں سوئی  
 راگتی کی آنچ نرم کونپاں کے روپ میں  
 دھل کے پھر عیار ہوتی

بڑھتی بیل پھیلتے درخت سے لپٹ گئی  
 اور گرم باز داؤں کے حلقت تنگ ہو گئے  
 زندگی سمٹ گئی

ہندوستان نیا جنم لے رہا ہے جو اپنے اپنے ادب اور سیاست اور ادب اور شعر ایک نئی  
دنیا بنانے میں سرگرم عمل ہیں۔ یہی دنیا کیا ہے، اور کتنے بیانات دوں پاس کی تھیں ہم  
رہی ہے! اس کو سمجھنا اور سمجھانا ماہنامہ کتاب کے پیش نظر ہے۔  
ادب کا کام زندگی کی تقیید کے علاوہ اُس کی تکلیف بھی ہے۔ اس سلسلے میں ملک کے  
مشہور اہل قلم کے مضامین کتاب میں ہر ہائی ہوتے ہیں۔ نیز اڑود انگریزی  
کی یہی کتابوں پر پہاہیت تفصیل اور محنت سے تبصرہ کیا جاتا ہے اور کم سے کم  
ایک مشہور کتاب کے مطالب کا خلاصہ ماہنامہ کتاب میں درج ہوتا ہے۔  
رسالہ کی سالانہ قیمت صرف روپے ہے

میونجر  
ماہنامہ کتاب لاہور  
سیریز ۲۶